حصہ اول

چند سوالات

مقامِ انسانیت کیا ہے؟

ہم جانتے ہیں کہ ایک پتھر بھی ہزاروں سال کی تبدیلیوں کے بعد ہیرے کی شکل اختیار کر لیتا ہے' انسان تو پھر اشرف المخلوقات بنا کر پیدا کیا گیا ہے۔ اندازہ لگایئے کہ اگر یہ انسان اپنی خداداد صلاحیتوں اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو جاننے کے قابل ہو جائے تو کیا بن سکتا ہے؟ لیکن وہی انسان اگر صحیح راستے سے بھٹک جائے تو پھر پتھر کی طرح کوئلہ بھی نہیں بن پاتا بلکہ ناسور بن کر رہ جاتا ہے اور انسانیت کے مقام سے ہی گر جاتا ہے۔ مقامِ انسانیت تک پہنچنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو ان تمام نعمتوں سے نوازا جن کا ذکر قرآن پاک میں ہے۔

> ''خدا ہی تو ہے جس نے دریا کو تمہارے قابو میں کر دیا ہے۔ تاکہ تم اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلاؤ اور تاکہ تم اس کے فضل (معاش) تلاش کرو تاکہ شکر کرو۔ اور جو کچھ آسمانوں میں ہے سب کو اپنے (حکم) سے تمہارے کام میں لگا دیا۔ جو لوگ غور کرتے ہیں ان کے لیے اس میں (قدرت خدا کی) نشانیاں ہیں''۔ (45: 12-13)

یعنی خدا نے یہ دنیا انسان کے لیے بنائی اور جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے وہ سب انسان کے لیے ہی بنایا گیا اور پھر انسان کو اتنی طاقت دی ہے کہ وہ ان چیزوں کو اپنے اختیار میں کر سکے۔ روزمرہ زندگی کی ایک عام سی مثال لے لیتے ہیں۔ ایک خاندان یا گھر کا نظام بہت سے لوگ مل کر چلاتے ہیں۔ ہر کسی کی مختلف ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ اگر اس کنبے میں سے ایک شخص کچھ بھی contribute نہ کر رہا ہو تو اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی' کوئی اس کی عزت نہیں کرتا' ہر طرف سے اسے لعن طعن سننی پڑتی ہے۔ جبکہ اس کی برعکس وہ شخص جو سب سے زیادہ contribute کرتا ہے اس کی بڑی عزت کی جاتی ہے' خاندان کا ہر فیصلہ اس کی مرضی کے مطابق ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ دنیا بھی ایک بڑے خاندان کی طرح ہے جس میں ہر کوئی اپنی اپنی ذمہ داری لے کر آیا ہے اور معاشرے میں اسی کی عزت ہوتی ہے جو اپنا کام صحیح طریقہ سے سرانجام دے رہا ہو اور اس دنیا کی ترقی میں اس کا کچھ حصہ ہو۔ یہ contribution جتنی زیادہ ہو اس دنیا میں اتنا ہی اس کا نام اور حیثیت زیادہ ہوگی۔

قرآن پاک میں ارشاد خداوندی ہے کہ:

> '' جب کہ ان کے مقابلے میں ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ پاؤں ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔ '' (24:24)

ہم نے ان چیزوں کا کیا استعمال کیا اور غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ یہی اختیار ایسی طاقت ہے جو کہ ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ آخر انسان اس دنیا میں ایسا کون سا مقصد لے کر آیا ہے جس کے لیے یہ دنیا بنائی گئی ہے اور پھر انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنا نائب بنا کر بھیجا۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

'' اور وہی تو ہے جس نے زمین پر تم کو اپنا نائب بنایا اور ایک دوسرے پر درجے بلند کیے تا کہ جو کچھ اس نے تمہیں بخشا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ '' (6: 125)

'' اللہ تعالیٰ کا انسان کو اپنا نائب بنا کر بھیجنا اور پھر اس کے آگے فرشتوں سے سجدہ کروانا بے معنی نہیں ہے۔ ''

جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

'' اور جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں ایک انسان کو خمیر کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں۔ تو جب میں اسے بنا چکوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے لئے سجدے میں گر پڑنا۔ چنانچہ تمام فرشتوں نے سب کے سب نے سجدہ کر لیا۔ مگر ابلیس کہ اس نے سجدہ کرنے والوں میں شمولیت کرنے سے (صاف) انکار کر دیا۔ ''(15: 28 - 31)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو فرشتوں کے سامنے اپنی پسندیدہ مخلوق بنا کر انہیں اس کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان میں ضرور ایسی کوئی خاص خوبی تھی جو فرشتوں سے بھی بڑھ کر تھی۔

'' اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو جنگل اور دریا میں سواری اور پاکیزہ روزی عطا کی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی۔ '' (17: 70)

اتنے دلائل کے بعد تو یہ واضح ہو گیا ہے کہ :-

☆ انسان کو بہت بڑا مقصد دے کر اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔

☆ انسان بے شمار صلاحیتوں اور طاقتوں کا مالک ہے۔

☆ جب انسان صحیح راستے کا انتخاب کر لے تو وہ خدا کی بہترین مخلوق کہلاتا ہے۔

جب کوئی شخص انسانیت سے ہٹ کر کوئی بات یا کسی فعل کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ انسانی اقتدار کھو بیٹھتا ہے۔ قدرت نے تو اسے بے شمار نعمتیں دے دی ہیں لیکن ان کا صحیح استعمال تو انسان پر ہی منحصر ہے۔ اگر ایک انسان قدرت کے قوانین کے خلاف چل کر کامیابی حاصل کرنا چاہے تو یہ ممکن نہیں ہوگا' سب سے پہلے اسے سیدھے راستے کا

تعین کرنا پڑے گا جو اسے کامیابی کی راہ پر لے جا سکے اور پھر اس پر قائم رہ کر ہی وہ منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ منزل مقصود ہی اصل مقامِ انسانیت ہے۔

☆ _____ ☆

خالی

آخر سیدھا راستہ کیا ہے؟

بحیثیت قوم آج ہم مشکل ترین دور سے گزر رہے ہیں۔ چاروں طرف دہشت گردی اور جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ آج ہم اُن حالات کا سامنا کر رہے ہیں جن کے لیے ہم قطعاً تیار نہیں تھے۔ زیادہ افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہم ابھی بھی بدلنے کو تیار نہیں ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد سے اب تک ہم مسلسل تباہی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ سڑکیں نئی بننے سے یا مغرب کی چند نئی نوازمات آنے سے ہمارے طرز و اطوار سے کوئی خاص بہتری کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ جبکہ بحیثیت قوم ہم بار بار دشمنوں کو اپنے کمزور ہونے کا احساس دلا کر اپنے پر ہنسنے کا موقع فراہم کرتے نظر آتے ہیں۔ کیا ہم سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں یا پھر اندھے، بہرے اور گونگے بن کر زندگی گزار لینا چاہتے ہیں؟ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ ہر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ایک فرد یا چند لوگوں کے کچھ کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ رویہ ہمیں اس موڑ پر لے آیا ہے کہ ہم مکمل طور پر ایک بھٹکی ہوئی قوم نظر آنے لگے ہیں۔ کسی بھی قوم کی تربیت کے ذمہ دار یا تو وہاں کے اساتذہ ہوتے ہیں یا پھر ماں باپ اور بزرگوار۔ دیکھنے میں یہ آ رہا ہے کہ ہماری نوجوان نسل کی ذمہ داری کوئی بھی اٹھانے کو تیار نہیں ہے بلکہ ان کو بالکل آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ جس طرف چاہیں نکل جائیں۔ حال ہی میں یہ تبدیلی دیکھنے میں آئی ہے کہ ہمارے بزرگوار بالکل بے بس ہو گئے ہیں۔ اگر ہم اس کو مغرب کا اثر کہیں تو صحیح نہیں ہوگا کیونکہ مغرب میں صورتِ حال کچھ اس طرح کی ہے کہ ماں باپ بچوں کو اپنے گھروں میں نہیں رکھتے لہٰذا وہ بچے جس طرح کی چاہیں زندگی گزار سکتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں ماں باپ زندگی کے آخری وقت تک بچوں کو اپنے گھروں میں رکھتے ہیں، ان کی دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں پہلے تو اُن کا کچھ نہ کچھ رعب بچوں پر قائم رہتا تھا لیکن اب صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارے بزرگوار سب کچھ اپنے سامنے ہوتا دیکھ رہے ہوتے ہیں لیکن بہت سے موقعوں پر کچھ کہنا بھی چاہتے ہیں لیکن اُن کی کوئی نہیں سنتا۔ لہٰذا اُن کی بچی کھچی عزت کا یہی تقاضہ ہے کہ چپ رہ کر سب کچھ برداشت کر لیں اور شاید یہی وہ کر بھی رہے ہیں۔ اس حقیقت کا ہمارے گھروں کے ماحول پر بہت بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ گھروں میں نانی دادی کا یہ کردار ہوتا تھا کہ بچوں کی عادتوں پر نظر رکھیں، غلطیوں سے روکیں ٹوکیں لیکن اب صورتِ حال یہ ہے کہ ایسے خاندان میں بھی جہاں پر پہلے اچھی روایات و اقدار اپنائی جاتی تھیں وقتاً فوقتاً میڈیا اور ماحول کے زیرِ اثر یہ روایات نہ صرف ختم ہوتی نظر آ رہی ہیں بلکہ اِن کی جگہ بہت بے ہودہ اور بے ہنگم روایات نے لے لی ہے۔ پرانے وقتوں میں دادی اماں بچوں کو بٹھا کر اچھی اور سبق آموز کہانیاں سناتی اور اپنی زندگی کے اچھے بُرے واقعات

بتاتی تھیں۔ اس طرح بچے اپنے خاندان کی اونچ نیچ بھی دیکھتے اور بہت کچھ سیکھ لیتے تھے۔اب صورتِ حال یہ ہے کہ امیر لوگ اپنے بچے نوکروں کے حوالے کر دیتے ہیں اور غریبوں کا ویسے ہی کوئی پُرسانِ حال نہیں ہے۔

گھروں کے اندر تو یہ صورتِ حال ہے اور گھروں کے باہر شدید معاشرتی دباؤ کے تحت ہماری اقدار تزلزل کا شکار ہیں۔اگر ہم راتوں رات سب کچھ ٹھیک کرنے کی تمنا بھی کریں تو صحیح نہیں ہوگا۔ہمیں کوئی ایسی راہ اختیار کرنی ہوگی جو چاہے دیکھنے میں مشکل ترین لگے یا طویل ترین لیکن ہمیں یہ یقین ہو کہ صحیح راہ یہی ہے تا کہ نتیجہ نظر آنے پر بھی ہم رکیں نہیں بس ثابت قدمی سے چلتے رہیں۔جیسا کہ آج سے چودہ سو سال پہلے ہوا تھا۔اسلام آنے کے پہلے دس سال میں صرف چند لوگ ایمان لائے لیکن اُن لوگوں کی ثابت قدمی نے ہی اس دنیا کا نقشہ بدل کر دکھا دیا' کیونکہ جیت آخر سچ کی ہی ہوتی ہے۔تیرہ سال تک مسلمان مصیبتیں برداشت کرتے رہے کیونکہ اسلام کا وہ مشکل ترین دور تھا۔اللہ کی طرف سے یہ اُس خاص جماعت کی آزمائش کا دور تھا جس نے آگے چل کر اسلام کو تمام دنیا میں پھیلانا تھا۔اگر ہم مکی سورتوں پر غور کریں تو صاف ظاہر ہوگا کہ یہ وقت مسلمانوں کی اخلاقی تربیت کا تھا۔اس نقطے کو سمجھنے کے لیے کسی فلسفی یا ماہرِ علوم کی ضرورت نہیں ہے کہ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے اُس کام کی تربیت لینا پڑتی ہے۔اگر ہم سیکھے بغیر کوئی کام کریں تو غلطی کا امکان باقی رہتا ہے۔اسلام وہ دین ہے جس نے ایک طرف پہلے سے بھیجے گئے خدائی علوم کو نہ صرف کائنات کے لیے محفوظ کرنا تھا بلکہ وہ واضح لائحہ عمل پیش کرنا تھا جس پر قائم رہ کر یہ کائناتِ خداوندی خوش اسلوبی سے چل سکے۔اندازہ لگائیں اِس مشکل ترین کام کو کرنے کے لیے لوگوں کو کس طرح تیار کیا گیا؟ یہ سب قرآن پاک کی مکی سورتوں میں ہمیں بتا دیا گیا ہے۔مکی سورتوں کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کفار پر زبردستی تھوپا نہیں گیا تھا بلکہ اچھے اخلاق اور صبر و تحمل کے وہ معیار اپنائے گئے تھے جن سے مسلمانوں کے کردار کی بلندی آسمانوں کو چھوتی نظر آتی تھی۔آج کا مسلمان اخلاقی لحاظ سے بدترین نظر آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ مسلمان قومیں ذلت و رسوائی برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔ہمیں یہ جان لینا چاہیئے کہ اسلام ویسے ہی پھیلے گا جس طرز پر اسلام چودہ سو سال پہلے پھیلا تھا صرف یہی وہ سیدھا راستہ ہے جو ہمیں کامیابی سے ہمکنار کر سکتا ہے۔چودہ سو سال تاریخ انسان کا ایک لمبا دور ہے اِس عرصے میں ہم بحیثیت مسلمان سب اونچ نیچ دیکھ چکے ہیں۔ہمیں اپنے ماضی سے سبق حاصل کرنا چاہیئے اور اپنی راہیں درست کرنی چاہییں۔اگر ہم نے ابھی بھی سبق نہ سیکھا تو ہمیں تباہی سے کوئی نہیں بچا سکے گا اور اس طرح کفار و مغرب کے ہاتھوں ذلت و رسوائی ہماری اور ہماری آنے والی نسلوں کا مقدر بنی رہے گی۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ اپنی قسمت بدلنے کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں۔سب سے پہلے بحیثیت انسان ہمیں اپنی درُستگی پر توجہ دینی چاہیئے۔ جب مسلمان ایک ایسی قوم بن جائیں گے کہ اپنے علم و شعور کی بدولت اس دنیا میں عزت کا

مقام حاصل کرسکیں تب ہی اللہ تعالیٰ بھی راضی ہوگا اور مسلمانوں کو وہ رتبہ ملے گا جو اُن کا حق ہے نہ کہ تربیت حاصل کئے بغیر لڑ مرنے سے۔ صحیح تربیت حاصل کئے بغیر تو لڑنا بھی خودکشی کے مترادف ہوگا۔ اگر ہم مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لیں تو تباہی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ تعلیم، علم، تربیت، اخلاق، مقام غرضیکہ ہر لحاظ سے مسلمان پستی کا شکار ہیں۔ فرقہ واریت انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ پوری دنیا میں اسلام پھیل رہا ہے لیکن کمی اس بات کی ہے کہ مسلمان اکٹھے نہیں ہیں۔ اس لیے دنیا میں ایک طاقت بن کر اُبھر نہیں سکے (اکٹھے ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم کسی ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں یا مسلمان ممالک میں رہیں بلکہ مسلمانوں کا غیر مسلم ممالک میں ہجرت کرنا اپنے اندر بہت بڑی حکمت اور مصلحت لیے ہوئے ہے) اکٹھے ہونے کا مطلب وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں واضح کیا کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقے میں نہ پڑو۔ اللہ کی رسی سے کیا مراد ہے؟ یہ وہ نظامِ حیات ہے جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے مخصوص کیا ہے۔ جس میں ہمارا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، لباس پہننا، رہنا مرنا سب واضح کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو علم اور سوچ کا ایک ایسا سرچشمہ یعنی قرآن عطا کیا جس کے مطابق زندگی گزارنے سے نہ صرف ہم اچھے انسان بن سکتے ہیں بلکہ سب مسلمان ایک سوچ کے متحمل بھی ہو سکتے ہیں۔ آج ہم اپنے اردگرد یہ دیکھتے ہیں کہ غلط سوچ رکھنے والے تعداد میں بہت زیادہ ہیں لہٰذا وہی طاقتور بھی دکھائی دیتے ہیں اور اچھی سوچ رکھنے والے تعداد میں بھی کم ہیں اور اثر و رسوخ میں بھی کمزور دکھائی دیتے ہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ آج ہمارے میں سے کتنے لوگوں نے قرآن کو ایک رسی کی طرح مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے۔ بس اتنے ہی لوگ ہمیں اچھے نظر آ سکتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن کو ہم باعثِ تعظیم طاق میں رکھیں اور خواہش یہ کریں کہ کسی طرح یہ دنیا جنت کا نمونہ بن جائے، لوگ اچھے ہو جائیں، غربت ختم ہو جائے یا مسلمان اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر لیں۔

ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دینِ اسلام کو مکمل طور پر پیش کیا۔ آج اگر ہم پچھلے چودہ سو سال کا جائزہ لیں تو دنیا کا کوئی بھی مسئلہ ایسا نہیں ملتا جس کا حل ہمیں اسلام کے اُس دور جس میں قرآن نازل ہوا، میں نہ ملے۔ مسئلہ چاہے انفرادی نوعیت کا ہو یا اجتماعی نوعیت کا نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کے مطابق اگر کسی مسئلے کا حل قرآن اور پھر حدیث و سنت سے نہ مل پائے تو صحابہ اکرامؓ کے طریقہ کار کو مدِ نظر رکھا جائے۔ یہاں تک کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ اکرامؓ کو ستاروں کی مانند قرار دیا ہے جو سورج کی روشنی سے ہی چمکتے ہیں۔ اگر ہم ایسا طرزِ عمل اختیار کریں جو قرآن کے حکم کے مطابق ہو اور حدیث و سنت کی روشنی میں صحابہ اکرامؓ کے طرزِ عمل کے مطابق لیا گیا ہو وہ کس طرح غلط ہو سکتا ہے۔ البتہ اگر کوئی معاملہ اتنی ہی انوکھی نوعیت کا ہو جس کا حل نہ ہی قرآن میں ملے نہ حدیث و سنت سے کچھ واضح ہو اور نہ ہی صحابہ اکرامؓ کے طرزِ زندگی سے اس کا کوئی جواز نکلتا ہو تو پھر

یقیناً علماء اکرام سے مدد لی جاسکتی ہے۔لیکن ہمارے ہاں یہ زیادہ آسان سمجھا جاتا ہے کہ نہ قرآن پڑھا جائے نہ ہی اُس کو سمجھا جائے' نہ حدیث وسنت پر غور کیا جائے بلکہ کسی ایسے انسان کی جس نے اپنی زندگی اِن علوم کو حاصل کرنے میں گزاری ہو اس سے پوچھ لیں۔ یہ رویہ بہت سے غلط فیصلوں کا پیشِ خیمہ ثابت ہوتا ہے۔اس کی وجہ بہت واضح ہے۔قرآنِ پاک اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتاب ہے۔قرآن پاک کی حکمت کا مقابلہ کسی انسان سے کیا بلکہ دنیا کے تمام علوم کو ملا کر بھی نہیں کیا جاسکتا۔اسی قرآن میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اخلاق قرآن ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر عمل سو فیصدی قرآن کے مطابق ہے اس پر مزید ہماری آسانی کے لیے صحابہ اکرامؓ کو بطور رول ماڈلز پیش کیا گیا۔اب دیکھا یہ گیا ہے کہ جب بھی کسی مسئلے پر بحث ہوتی ہے تو ان تینوں یعنی قرآن' حدیث وسنت اور صحابہ اکرامؓ کو نظر انداز کر کے ہم فقہ کے علوم اور فرقہ میں زیادہ دلچسپی ظاہر کرتے ہیں۔اس رویہ کی کچھ وجوہات ہیں مثلاً اس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر آپ کو کسی نے غلط حل بتا دیا تو ذمہ داری بتانے والے پر ڈالی جاسکتی ہے کہ میں نے تو فلاں سے پوچھ لیا تھا لہٰذا اگر غلط بھی ہے تو میرا کوئی ذمہ نہیں ہے۔اس طرح دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اگر آپ کو کوئی بات یا مسئلے کا حل پسند نہ آئے تو آپ اس شخص کو اور اس کی عقل کو رد کر سکتے ہیں۔ہاں جب کوئی ایسی بات سننے کو ملے جو آپ کے اپنے فائدہ کی لگے تو وہ عالم بہت عظیم لگنے لگتا ہے۔اس کی ہر بات میں سچائی اور خلوص نظر آنے لگتا ہے اور یہ سلسلہ تب تک جاری رہتا ہے جب تک کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جو آپ کے ذاتی مفادات کے خلاف جاتی ہو۔ پھر آپ اس کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا استاد مان لیتے ہیں اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔قرآن پاک کی تعلیمات اور ان کا عملی نمونہ یعنی حدیث وسنت تو نہ آپ کے مزاج کا پاس کرتی ہے نہ ہی حالات کا۔ہمیں اس طرزِ عمل کو بدلنا ہوگا چاہے ہمیں پسند آئے یا نہ آئے ہماری سوچ ہمارا ساتھ دے یا نہ دے سیدھا راستہ تو بس ایک ہی ہے اور وہ راستہ قرآن کا بتایا ہوا راستہ ہے۔لہٰذا اگر ہم ادھر ادھر بھٹکنے کی بجائے اس راستے پر گامزن رہیں جو یقیناً بہترین بھی ہے اور کامیابی کی گارنٹی بھی دیتا ہے تو ہم بہت سی الجھنوں سے بھی بچ سکتے ہیں اور اُس راستے پر ہمیں اپنے تمام مسائل کا حل بھی ملے گا۔اپنی ناقص عقل پر زیادہ بھروسہ کرنے کی بجائے اگر ہم صرف ایک عہد کریں کہ زندگی کا ہر معاملہ چاہے وہ دینی ہو یا دنیاوی' انفرادی ہو یا اجتماعی یا کچھ بھی معاملہ ہو ہم صرف اللہ پر بھروسہ کریں گے اور قرآن کے مطابق زندگی گزاریں گے تو سمجھ لیں کہ دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی ہمارا مقدر ضرور بنے گی۔ یہ جان لینے کے بعد کہ دنیا اور آخرت میں کامیابی سے ہمکنار ہونے کے لیے ہمیں اُس راستے پر چلنا پڑے گا جو خاص اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے نہ صرف مخصوص کیا بلکہ ہمیں مختلف طریقوں سے سمجھایا' بتایا اور سکھایا بھی ہے۔انسانی تاریخ گواہ ہے کہ باقی تمام راستے انسان کو کامیاب کرنے میں ناکام رہے ہیں۔اب مزید اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے اور وقت ضائع کرنے سے

کوئی دانشمندانہ فیصلہ نہ ہوگا لہٰذا آیئے عہد کریں کہ اسی سیدھے راستے کو اپنائیں گے جو بہترین نتائج کی گارنٹی لے کر آیا ہے۔

☆ _____ ☆

نئی زندگی کا آغاز کیسے کریں؟

روزمرہ زندگی میں ہم بے شمار مسائل سے دوچار رہتے ہیں اور ہر انسان اپنے تئیں اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ کسی طرح ان مسائل کو حل کروں۔ ہر ایک کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کوشش میں اس سے کوئی غلطی بھی نہ ہو جبکہ ہزار جتن کے بعد بھی انسان اس سے بچ نہیں سکتا اور کہیں نہ کہیں کوتاہی کر ہی بیٹھتا ہے۔ کون سا انسان ایسا ہے جس سے کبھی غلطی نہ ہوئی ہو اور قرآن پاک کا فرمان ہے:

'' اور انسان طبعاً کمزور واقع ہوا ہے۔ '' (4: 28)

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان بنیادی طور پر کمزور واقع ہوا ہے لہٰذا اس سے غلطیاں بھی سرزد ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ جلد بازی، ناشکری، مایوسی، تنگ دلی، کم حوصلہ، خودسری اور نہ جانے کون کون سی خامیاں انسان کی فطرت کا حصہ ہیں۔ اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کمزوریاں کم و بیش سب انسانوں میں موجود ہیں جس کی وجہ سے انسان غلطیوں کا پتلا قرار دیا جاتا ہے۔ اگر یہ سب انسانوں کا مشترکہ مسئلہ ہے تو پھر ہمیں ایک دوسرے کی غلطیاں نظر انداز کر دینی چاہئیں جبکہ ہم ایسا نہیں کرتے۔ حالانکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ ہر دوسرے کی طرح ہم میں بھی ہزار ہا خامیاں موجود ہیں اور اگر ہم خود لوگوں کی خامیاں نظر انداز نہیں کریں گے تو دوسرے ہماری کوتاہی کو بھی معاف نہیں کریں گے۔ اس کے علاوہ روزمرہ کی زندگی میں جو چھوٹی موٹی کوتاہیاں ہم سے ہو جاتی ہیں ان کو بھی ہم ذہن پر سوار کر لیتے ہیں، اس طرح ہم ذہنی پستی کا شکار رہتے ہیں۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ انسان جانے انجانے میں کوئی غلطی کر بیٹھتا ہے اور باقی زندگی پچھتاوے کے احساس میں ختم کر دیتا ہے۔ یہ احساسِ کمتری انسان کو کچھ کرنے کے قابل نہیں چھوڑتا اور انسان یہ سوچنے کی صلاحیت بھی کھو بیٹھتا ہے کہ اگر غلطی ہو ہی گئی ہے تو اس کا ازالہ کس طرح کیا جائے۔ اگر ہم یہ سوچ لیں کہ انسان ہونے کے ناطے ہر ایک کے پاس کچھ نہ کچھ غلطی کی گنجائش ہے تو احساس محرومی کم ہو جائے گا اور ہم کوتاہیوں سے کچھ سیکھ کر آگے بڑھنے کے قابل ہو سکیں گے۔ موجودہ دور میں ہم سب بے شمار مسائل سے دوچار ہیں اور ہر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ یہ سب شاید میرے ساتھ ہی ہو رہا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔

فرق صرف ذہنیت کا ہے۔ کچھ لوگ ہمت سے کام لیتے ہیں اور غلطیوں سے سبق سیکھ کر بہتر طریقے سے زندگی گزارنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور بہت سے لوگ احساس محرومی اور پچھتاوے کے چکر میں ایسے جکڑے جاتے ہیں کہ پھر کبھی نکل نہیں پاتے اور زندگی یوں ہی گزر جاتی ہے۔ جبکہ ہمیں یہ بھولنا نہیں چاہیئے کہ جہاں قدرت نے انسان

کی فطرت میں کئی خامیاں رکھیں ہیں وہاں اسے بے شمار صلاحیتوں سے بھی نوازا ہے۔

قرآن پاک میں آیا ہے۔

'' اور جو کچھ تم نے مانگا سب میں نے تمہیں عنایت کیا اور اگر خدا کے احسان گننے لگو تو شمار نہ کر سکو (مگر لوگ نعمتوں کا شکر نہیں کرتے) کچھ شک نہیں کہ انسان بڑا بے انصاف (اور) ناشکرا ہے۔ ''

(14:34)

اب ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انسان ہزار چاہے کوتاہیوں سے بچ نہیں سکتا لیکن اپنی ناکامی کو کامیابی میں بدل ضرور سکتا ہے۔ اگر ہم ہر غلطی سے ایک سبق سیکھ لیں تو ہم ایک تو دوبارہ وہ غلطی نہیں کریں گے اور جو سبق ہم سیکھ چکے ہیں وہ ہماری زندگی میں ہمارے کام بھی آئے گا۔ اگر ہمارا سارا دھیان اسی طرف لگا ہوگا کہ کہیں غلطی نہ ہو جائے تو عدم اعتمادیت کی وجہ سے ایک طرف تو غلطیاں زیادہ ہوں گی اور دوسری طرف ہم آگے کی طرف دیکھ ہی نہیں پائیں گے اور زندگی منجمد ہو کر رہ جائے گی۔

یاد رکھیں ہم سب انسان ہونے کے ناطے خامیوں کی گنجائش رکھتے ہیں' ہاں یہ تو ممکن ہے کہ ایک فرد میں ایک طرح کی خامی ہو اور دوسرے میں دوسری طرح کی لیکن خامیوں سے بالکل پاک ہونے کی اہلیت ہم میں نہیں ہے۔ دوسری بات یہ یاد رکھنے کی ہے کہ خامیوں کی نسبت ہمیں قدرت نے خوبیاں زیادہ دی ہیں۔ ہمیں انہیں اجاگر کرنے کی اور اپنے اعمال کو ٹھیک سمت میں متعین کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے:

'' عصر کی قسم کہ انسان نقصان میں ہے مگر وہ لوگ نہیں جو ایمان لائے نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق کی تلقین کرتے رہے اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔ '' (103: 1 - 3)

یعنی خدا کا فرمان ہے کہ اگر انسان کا ایمان اور اس کے اعمال صحیح نہیں ہونگے تو پھر انسان کے لیے نقصان ہی نقصان ہے اور اگر ہم پرہیزگاری کا راستہ اپنائیں تو ہمارے لیے آسانیاں ہیں۔ دوسروں کی خامیوں کو نظر انداز کرنا اور معاف کرنا ہی ہمارے لیے آسانی پیدا کرے گا کیونکہ اگر ہم لوگوں کے ساتھ اچھا رویہ اپنائیں گے تو وہی لوگ جب ہم سے کوئی کوتاہی ہوگی تو وہ بھی درگزر کریں گے اور اس طرح معاشرے میں نرمی اور سکون کا ماحول بنے گا۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ آپ کسی کا بھی حال پوچھیں تو آگے سے مایوسی کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا۔ شاذ و نادر ہی کوئی اچھا کلمہ سننے کو ملے گا' نہیں تو زیادہ تر لوگ گفتگو کا آغاز ہی شدید تکلیف کی صورت میں کرتے ہیں۔ مثلاً آپ صحت کے بارے میں پوچھیں تو ہر طرح کی بیماری سننے کو ملے گی' کاروبار کے بارے میں پوچھیں تو ملک کی معیشت سے لے کر موسم تک کا گلہ سننے کو ملے گا۔ اس طرح کے لوگ اپنی ناکامیوں کا اثر دوسروں میں سرائیت کر دیتے

ہیں' یہی وجہ ہے کہ آج ہمارا معاشرہ سخت مایوسی اور بے چینی کا شکار ہے۔لوگوں کی جسمانی اور ذہنی صحت کا معیار دن بدن گرتا جا رہا ہے' زندگی میں اتار چڑھاؤ تو آتے رہتے ہیں کم وبیش ہر انسان مختلف مسائل میں گھرا رہتا ہے۔یہی زندگی ہے' کامیاب صرف وہ لوگ ہیں جو زندگی کی باگ دوڑ میں ثابت قدمی کے ساتھ صحیح راستے پر چلتے رہتے ہیں یہی کامیابی کا راز ہے۔لیکن پھر انسان کی فطری کمزوریاں اس کی ترقی کے راستے میں آجاتی ہیں کیونکہ انسان جلد باز واقع ہوا ہے۔جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

'' اور انسان جس طرح (جلدی سے) بھلائی مانگتا ہے اسی طرح برائی مانگتا ہے اور انسان جلد باز (پیدا ہوا) ہے۔'' (17: 11)

غور کریں کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن پاک میں انسان کی خامیوں کے بارے میں اس لیے بتایا گیا ہے تا کہ انسان مایوس ہو جائے اور کچھ کرنے کے قابل نہ رہے۔'ہرگز نہیں' یہ آگاہی تو اصل تقویت کا سرچشمہ ہے۔مثال کے طور پر کوئی بھی استعمال کی چیز لے لیں اگر اس چیز میں کوئی خرابی ہے اور آپ جانتے ہیں تو آپ اسے احتیاط سے استعمال کریں گے اور اس پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالیں گے تو وہ آپ کے لیے زیادہ مفید بھی رہے گی اور دیر تک قابلِ استعمال بھی' جبکہ اگر آپ اس چیز کی کمی بیشی سے واقف نہیں ہوں گے تو وہ چیز جلد ہی نا قابلِ استعمال اور آپ کے لیے بے کار ہو جائے گی اور آپ اس کے فوائد سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ بالکل اسی طرح ہم جانتے ہیں کہ ہر انسان بے شمار خامیوں کا حامل ہو سکتا ہے تو یہ خدشہ بھی کم ہو جاتا ہے کہ اگر کوتاہی ہو بھی گئی تو کیا ہوگا۔لہٰذا ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انفرادی نقطۂ نظر سے ہم سے چاہے کتنی ہی کوتاہیاں ہو چکی ہوں ان کا اثر آنے والی زندگی پر ہرگز نہیں پڑنا چاہیئے۔انسان ہونے کے ناطے غلطیاں صرف سبق سیکھ کر آگے بڑھنے کے لیے ہی ہوتی ہیں اور قومی نقطۂ نظر سے ایک صحت مند معاشرے کی بقاء کا انحصار اسی طریقہ کار میں پنہاں ہے۔

☆ _____ ☆

ہماری انفرادی ذمہ داری کیا ہے؟

کوئی بھی کام کرنے سے پہلے یہ جان لینا بہت ضروری ہے کہ یہ کام کس کی ذمہ داری ہے۔ چاہے یہ کام چھوٹی اور انفرادی نوعیت کا ہو مثلاً یہ کام ایک قدم اٹھانے کا ہو یا پھر ایک ملک چلانے کا جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ یہ کس کی ذمہ داری ہے' مثبت نتائج ظاہر نہیں ہو سکتے۔ بحیثیت انسان ہماری بہت بڑی کمزوری ہے کہ جب کوئی کام اچھا ہو جاتا ہے تو سب اُس کے ذمے دار بننا چاہتے ہیں اور اگر کوئی کام خراب ہو جائے تو کوئی بھی اس کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں ہوگا۔ لہٰذا یہ فیصلہ پہلے سے کر لینا چاہیئے کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ مزید وضاحت کے لیے ایک مثال لیتے ہیں' مثلاً ایک چور جب چوری کرتا ہے تو اپنے فعل کی ذمہ داری دوسروں (غربت' بے روزگاری وغیرہ وغیرہ) پر ڈالتا ہے۔ اگر چور کو یہ یقین دہانی کرائی جائے کہ اس کے فعل کا ذمہ دار وہ خود ہی ہے اور نتائج بھی اسی کو بھگتنے پڑیں گے تو وہ یقیناً چوری کرنے سے پہلے سوچے گا کہ اگر میں چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا تو دنیا کو پتہ چلے گا کہ میں ضرورت مند یا مجبور' ناکارہ یا اپنی ذمہ داری اٹھانے کے قابل نہیں ہوں۔ لیکن اُس نے پہلے ہی سے سوچا ہوتا ہے کہ اپنی ساری کمزوریوں کا ذمہ دار کسی اور کو ٹھہرانا ہے' لہٰذا چوری کرنا جذباتی طور پر اُس کے لیے نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ یہی معاملہ زندگی کے ہر معاملے میں ہے۔ اگر ہم اپنے چاروں طرف نظر دوڑائیں تو یہی فارمولہ اپنا کام دکھاتا نظر آتا ہے۔ کوئی بھی اپنی ذاتی یا انفرادی ذمہ داری اٹھانے کو تیار نہیں ہے۔ ایک گھر کا حال لے لیں یا پھر ایک قوم کے حالات کا جائزہ لیں' ہر کوئی کسی نہ کسی پر ذمہ داری ڈالے ہوئے ہے۔ یہ تباہ کن رویہ ہمیں کبھی بھی اپنی خامیوں کی طرف توجہ دینے نہیں دیتا۔ لہٰذا جب خامیاں نظر ہی نہیں آتیں تو ہم اُن کو درست کیونکر کریں گے؟

آج جس سیدھے راستے پر چلنے کی ہم تمنا کر رہے ہیں اس کی تو پہلی شرط ہی تربیت ہے یعنی اپنے آپ کو اس قابل کرنا کہ ہم ثابت قدمی کے ساتھ دنیا کے کامیاب لوگوں کے نقشِ قدم پر چل سکیں۔ جبکہ صورتِ حال یہ ہے کہ ہم اپنی خامیوں کی طرف سے تو مکمل طور پر بے خبر ہوتے ہیں جبکہ ہر دوسرے شخص میں ہمیں بہت برائیاں نظر آتی ہیں۔ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ صرف یہ سوچ ہی کہ دوسرے غلط ہیں اور ہم ٹھیک' غلط رویئے کی نشاندہی کے لیے کافی ہے۔ ایک 75 سالہ خاتون سے پوچھا گیا کہ کیا آپ محسوس کرتی ہیں کہ آپ بوڑھی ہو گئی ہیں تو اس نے جواب دیا کہ ''نہیں میں بوڑھی نہیں ہو سکتی'' جب تک میں یہ سمجھتی رہوں گی کہ ابھی مجھے بہت کچھ سیکھنا ہے میں محسوس کرتی ہوں کہ جو کچھ اب تک میں نے زندگی کے بارے میں جانا ہے وہ کافی نہیں ہے۔ یقیناً جب تک انسان میں آگے بڑھنے اور بہتر

سے بہتر ہونے کا جذبہ موجود ہو تبھی وہ انسان کہلانے کا حق رکھتا ہے وگرنہ کھانا پینا' سونا' خواہشات رکھنا اور اُن کو پورا کرنے کے لیے کچھ بھی کر گزرنا تو جانوروں کا شیوہ ہے۔

انسان ہونے کے ناطے ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنے اعمال کی ذمہ داری اٹھائیں۔ چند ماہ قبل ایک محفل کے دوران کچھ لوگ بیٹھے تھے اور ان میں سے ایک شخص اپنا قصہ سنا رہا تھا کہ اُس نے کس طرح دھوکہ دے کر ہیر پھیر کیا اور کافی پیسے بچا لیے سننے والے اُس کی ذہانت کی داد دے کر چلے گئے۔ اُس وقت تو ہمیں یہی احساس ہوا کہ اے پاک پروردگار تیری اس دنیا میں لوگ کتنی دیدہ دلیری کے ساتھ ناانصافی بھی کر رہے ہیں اور پھر اُس پر فخر بھی اور تو نے اُن کی رسی دراز کی ہوئی ہے کہ ان لوگوں کو احساس تک نہیں۔ لیکن ایسا نہیں تھا ہمیں جلد ہی اطلاع ملی کہ وہ شخص شدید بیمار ہے اور پھر بہت لمبے عرصے تک بیمار رہنے سے اُس کا کاروبار سخت متاثر ہوا ہے۔ جو چند روپے اُس نے دھوکہ دہی کے ذریعے بچا تو لیے تھے لیکن اُس سے کئی گناہ زیادہ کا وہ نقصان اٹھا چکا ہے۔ اُس شخص کے رویے میں کوئی تبدیلی آئی یا نہیں اس کی ہمیں خبر نہیں لیکن یہ معلوم ہو گیا کہ ہم اپنی ذمہ داری بھول سکتے ہیں لیکن وہ رب جس نے اس دنیا کو ایک خاص نظام کے تحت بنایا ہے اپنا کام کر دکھاتا ہے۔ یقیناً ہمارے ایک ایک عمل کا حساب آج یا کل ہونے ہی والا ہے۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ آج سے چودہ سو سال پہلے ہمارے نبی پاک ﷺ نے ہماری تربیت کا آغاز کہاں سے کیا تھا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ یہ کام رسولِ خدا ﷺ نے اپنی ذات سے شروع کیا۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو پہلی وحی بھیجی آپ ﷺ تو پہلے ہی سے اعلیٰ اخلاق کے بلند ترین درجے پر فائز تھے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے دشمن بھی یہ ماننے پر مجبور تھے کہ آپ ﷺ صادق اور امین ہیں۔ اس کے باوجود آپ ﷺ پر لازم تھا کہ اُس ہر حکم کو بجالاتے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتا۔ پہلے خود عمل کرتے اور اس طرح دوسروں کے لیے نمونہ پیش کرتے۔ تیرہ سال کے طویل عرصے میں نبی پاک ﷺ کو تکلیفوں' مصیبتوں اور پریشانیوں کے علاوہ کچھ نہیں ملا یہ وہ دور تھا جس میں صحابہ اکرامؓ کو اپنی ذمہ داری اٹھانے کی تربیت ملی جب نبی پاک ﷺ کا یہ چھوٹا سا گروپ مکمل طور پر تیار ہو گیا تو پھر اُن کو ہجرت کا حکم ملا جہاں سے اسلام کے دوسرے دور کا آغاز ہوا جس میں مسلمانوں کو طاقت' غلبہ اور فتوحات نصیب ہوئیں۔ اب ہمارا حال یہ ہے کہ ہم وہ تو سب حاصل کرنا چاہتے ہیں جو بحیثیت مسلمان ہم اپنا حق سمجھتے ہیں لیکن تربیت اور صبر کے اس امتحان میں فیل ہو جاتے ہیں جو اس کامیابی کی اصل بنیاد ہے۔ خواہش تو سب کی یہی ہوتی ہے کہ امتحان نہ دینا پڑے ویسے ہی کوئی ہمیں پاس کر دے لیکن ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا اگر ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں تو آزمائش و امتحان کے ہر اُس مرحلے سے گزرنا پڑے گا جو کامیابی کا لازمی جزو

ہے۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ ہمیں انفرادی اور اجتماعی بہتری کے لیے کس طرح کے رویہ کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ ابھی ہم تربیت کے اس ابتدائی مرحلہ میں ہیں جہاں ہم کامیابی کی خواہش ضرور کر سکتے ہیں لیکن شاید کامیابی حاصل کرنے میں ہمیں بہت مشکلات درپیش ہیں۔ اُس کی کئی وجوہات ہیں جن میں سرِ فہرست ہماری اخلاقی پستی اور ناآگہی ہے۔ لہٰذا ہمیں سب سے زیادہ توجہ ان دو پہلوؤں پر دینی ہوگی۔ اخلاقی لحاظ سے ہم ترقی یافتہ قوموں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ تہذیب یافتہ دنیا میں ہمیں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اپنے نفس کی پرورش میں ہم اس حد تک کھو چکے ہیں کہ ہمیں خبر ہی نہیں ہے کہ ہم انسانیت کے کس مقام پر کھڑے ہیں یہ سب کچھ کیا دھرا ہمارا ہے دوسروں کو اپنی ناکامیوں کا ذمہ دار ٹھہرا کر ہمیں کچھ حاصل ہونے والا نہیں۔ آیئے آج یہ وعدہ کریں کہ ہم میں سے ہر ایک اپنی انفرادی ذمہ داری کو پہچانے گا اور اپنی تربیت کا خود بیڑا اٹھائے گا کیونکہ اچھا انسان بننے کا فائدہ بھی تو پھر ہماری ذات کو ہی ہونا ہے۔

☆ _____ ☆

مقصدِ حیات کیا ہے؟

ہر انسان کے نزدیک اس کی زندگی کا مقصد موجود ہے۔ ہر انسان نے اپنے اردگرد کے ماحول کے مطابق اپنی اپنی سوچ کے دائرے میں ضرور کچھ نہ کچھ مقصدِ حیات بنا رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک چھوٹی سی مخلوق کی شکل میں دنیا میں بھیجا ہے یہ جانتے ہوئے کہ دنیا میں آنے سے لے کر زندگی کے آخری لمحے تک اسے رہنمائی کی ضرورت رہے گی' خدا نے ہر انسان کو صحیح اور غلط کی پہچان کے لیے ضمیر کی صلاحیت سے نوازا ہے۔ ہمارا معصوم بچپن جو اس صلاحیت سے ناواقف ہوتا ہے اس کی حفاظت اور پرورش کے لیے ماں باپ اور استاد کے ذریعے سے ہر طرح کی رہنمائی فراہم کی جاتی ہے یہ قدرت کا نظام ہے اور ہم اس سے بخوبی واقف ہیں اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ قدرت کا یہ نظام اس قدر منظم ہے جو محض اتفاق نہیں ہوسکتا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کائنات کی کوئی بھی چیز بغیر کسی مقصد کے پیدا نہیں کی گئی اور پھر انسان کوئی بہت اہم مقصد اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

'' کیا انسان سمجھتا ہے کہ اسے بلا مقصد پیدا کیا گیا ہے۔ '' (23: 115)

اصل مقصد کی تلاش میں اگر ہم کچھ نظر اپنے اردگرد کے ماحول پر ڈالیں تو شاید ہمیں کچھ مدد مل سکے اور اصل مقصدِ حیات تک پہنچنے میں آسانی ہو جائے۔ عام طور پر انسان نے رزق کی تلاش اور جستجو کو ہی اپنا مقصدِ حیات قرار دیا ہوا ہے۔ بچہ چاہے جس کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو ہوش میں آتے ہی یہ محسوس کرتا ہے کہ گھر کا ہر فرد کسی نہ کسی طرح روزگار سے وابستہ ہے۔ ہر گھر میں دن کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ باپ یا تو دفتر جا رہا ہے یا مزدوری پر۔ بعض اوقات ماں باپ دونوں ہی کام پر نکل جاتے ہیں اور گھر کے باقی افراد بھی روزگار کی فکر میں رہتے ہیں۔

زندگی کا کاروبار لین دین پر مبنی ہے' کوئی پیسہ کمانے جا رہا ہے تو کوئی پیسہ کمانے کے لیے ڈاکٹر یا انجینئر بننے کے خیال سے سکول جا رہا ہے۔ چھوٹے بچوں سے جب یہ پوچھا جاتا ہے کہ وہ بڑے ہو کر کیا بنیں گے تو اس طرح وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کچھ بننا ہی چاہیئے۔

پاکستان جیسے چھوٹے ملک میں ایک دور میں ایک یا پھر دو ہی ایسے پیشے دیکھنے میں آتے ہیں جو ترقیاتی یا مالیاتی لحاظ سے سودمند ہوں۔ جیسا کہ اب سے دس سال قبل ڈاکٹر یا انجینئر بننا ہی فائدہ مند تھا پھر MBA کا دور آیا اور اب کمپیوٹر کا زمانہ ہے۔ ایک بچہ دس سال کی عمر میں جو رجحان دیکھتا ہے وہ بھی اسی دوڑ میں شامل ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو وہی کام کرنے پر مجبور پاتا ہے جس کا شور چاروں طرف سنائی دیتا ہے۔ یہی بچہ جب بڑا ہو کر عملی میدان میں قدم رکھتا

ہے اور ارد گرد نظر دوڑاتا ہے تو اسے اپنے چاروں طرف ایک ہلچل اور بے چینی سی محسوس ہوتی ہے۔ اگر خوش قسمتی سے اس بچے کو بہترین تعلیم اور تربیت مل گئی تو وہ یقیناً اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر کامیاب لوگوں کی صف میں شامل ہو جائے گا۔

یہاں اس بات پر غور کرنا اشد ضروری ہے کہ آخر یہ بہترین تعلیم و تربیت کیا ہے۔ ہمارے ہاں عام فہم زبان میں اچھی تعلیم و تربیت وہ ہوتی ہے جو ایک اچھی ڈگری دلا کر اچھی سی نوکری تک پہنچا دے اور آپ کو اس قابل بنا دے کہ آپ اپنا ذاتی گھر اور گاڑی لے سکیں، یہی آپ کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی ہے۔ یعنی کسی بھی حال میں آپ کو اپنے ارد گرد کے لوگوں، رشتہ داروں اور دوستوں سے آگے نکلنا ہے۔

دوسرا اہم پہلو جس پر ہم بہت انحصار کرتے ہیں وہ ہے زندگی، زندگی ہے تو سب کچھ ہے۔ ہمیں زندگی کی بہت چاہت ہے۔ ہمارے لیے وہ تمام مادی ضروریات جن کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں زندگی کے ساتھ ہی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ زندگی کیسے گزاری جائے اس کا تعین ہم اپنی سوچ کے مطابق کرتے ہیں۔ اگر ہماری زندگی کا مقصد اچھی زندگی ہی گزارنا ہے تو پھر تو یہ زندگی جتنی بھی ہو کم ہے اور اسے قائم رکھنے کے لیے ہم کچھ بھی کرنے کو تیار رہیں گے۔ اگر زندگی میں آرام و آسائش کی کوشش کرنا ہی مقصد حیات ہے تو وہ تو ہم سب اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کر رہے ہیں۔ پھر زندگی گزارنے کا یہ طریقہ بہترین نتائج کا حامل ہونا چاہیئے جو کہ نہیں ہے اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ کہیں ہم غلط راستے پر تو نہیں چل پڑے۔

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ زندگی کے دو اہم پہلو جن کا ہم نے ابھی تجزیہ کیا ہے ہمارے اختیار میں ہیں ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق رزق و موت خدا کے اختیار میں ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

''اور زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں جس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو اور وہ جانتا ہے کہ اس کے ٹھہرنے کی جگہ کو اور جہاں وہ سونپا جائے۔'' (11: 6)

یقیناً ہم بھٹک ہی چکے ہیں جو ان چیزوں کے حصول کے لیے زندگیاں گزار رہے ہیں جو کہ ہمارے بس میں ہی نہیں ہیں۔ یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ اس کی کل کائنات میں کس کو اور کہاں رزق بھیجنا ہے۔ اس کے حکم سے ہی رزق تو پتھر کے نیچے پڑے ہوئے کیڑے کو بھی مل جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ:

'' اور بہت سے جانور ہیں جو اپنی روزی اٹھائے نہیں پھرتے، اُن سب کو اور تمہیں بھی اللہ ہی روزی دیتا ہے۔ وہ بڑا ہی سننے والا اور جاننے والا ہے۔ '' (29: 60)

اور جہاں تک رزق کے کم یا زیادہ ہونے کا تعلق ہے تو وہ حضور اکرم ﷺ کی حدیث شریف سے واضح ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ:

"لوگو! خدا کی نافرمانی سے ڈرو اور رزق کے حصول میں پسندیدہ طریقے اختیار کرو اس لیے کہ کوئی انسان اس وقت تک مر نہیں سکتا جب تک اسے اس کے حصے کا رزق پورا پورا نہ پہنچ جائے اگرچہ اس کے ملنے میں کچھ تاخیر ہو جائے۔" (ابن ماجہ)

انسان کی اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے اس کا رزق بکھر جاتا ہے اور اس میں سے برکت اُڑ جاتی ہے۔ غلط طریقوں سے حاصل کیا گیا رزق حلال سے حرام ہو جاتا ہے۔ محنت سے رزق حلال کمایا جا سکتا ہے' سمجھ بوجھ سے اس میں برکت ڈالی جا سکتی ہے' خدا کے احکامات کے مطابق خرچ کر کے اس سے خوشی حاصل کی جا سکتی ہے اور ایمانداری کے بل بوتے پر دین و دنیا کے بے شمار فائدے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر ہمیں اور کیا چاہیئے۔ زندگی کیسے گزاری جائے یہ تو ہمارے بس میں ہے لیکن زندگی بذاتِ خود ہمارے اختیار میں نہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ نے جو سادہ زندگی ہمیں مثال کے لیے دی وہ اس قدر سادہ ہے جو تمام لغویات کی نفی کرتی ہے۔

یہ جان لینے کے بعد کہ انسان کو دنیا میں بھیجنے کا مقصد محض ظاہری طور پر کامیاب زندگی گزارنا نہیں ہے' ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ پھر زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اگر ایک لمحے کے لیے بھی ہم یہ فرض کر لیں کہ جو بھاگ دوڑ زندگی میں ہم نے اب تک کی ہے سب رائیگاں تھی تو زندگی ایک دم بے کار سی لگنے لگے گی اور ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ پھر آخر اس زندگی کا مقصد کیا ہے؟

جب ہم کسی معاملے کی تہہ تک پہنچنا چاہیں تو اس کی ابتداء پر ضرور غور کرنا چاہیئے۔ جب حضرت آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے اپنی مخلوق بنا کر پیش کیا تو فرشتوں کا سب سے پہلا سوال یہی تھا کہ اے خدا یہ انسان تیرے لیے ایسا کیا کام کر سکتا ہے جو ہم نہیں کر سکتے؟ آیئے انسان کی ابتدا پر غور کریں۔

"اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں تو انہوں نے کہا ایسے شخص کو کیوں پیدا کرتا ہے جو زمین میں فساد کرے اور خون بہائے؟ اور ہم تیری تسبیح' حمد اور پاکیزگی بیان کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام نام سکھا کر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا اگر تم سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ ان سب نے کہا اے اللہ تیری ذات پاک ہے ہمیں تو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہمیں سکھا رکھا ہے پورے علم و حکمت والا تو ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم سے فرمایا تم ان کے نام بتا دوں جب انہوں نے بتا دیئے تو فرمایا کہ کیا میں نے تمہیں نہ کہا تھا کہ زمین و آسمان کا غیب میں ہی

جانتا ہوں اور میرے علم میں ہے جو تم ظاہر کر رہے ہو اور جو تم چھپاتے تھے۔ اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا۔ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں ہو گیا۔'' (2: 30-34)

خدا نے انسان کو ان تمام علوم سے بہرہ ور کیا جو اور کسی مخلوق کے حصے میں نہیں آئے۔ اسی طرح حضورِ اکرم ﷺ کی وہ مشہور حدیث جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ'' علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ ''

اس دور میں جبکہ سفر پیدل کیا جاتا تھا عرب سے چین تک جانے کی مثال ایسے ہی تھی کہ جیسے علم حاصل کرنے کے لیے اپنی تمام ہمت' وقت اور کوشش صرف کر دی جائے پھر اللہ تعالیٰ کا وہ فرمان کہ:

'' زمین پر چلو پھرو اور غور کرو۔ '' (3: 137)

یہ سب یقیناً ہماری سوچ کا رخ علم حاصل کرنے کی طرف کرتا ہے۔ شاید علم حاصل کر کے ہی ہم اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔

علم کی اہمیت پر جتنی بھی تحقیق کی جائے کم ہے لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ علم حاصل کرنے کے لیے تو ہم بہت کچھ کر رہے ہیں ہر گلی محلے میں بیشمار سکول کھل چکے ہیں' ہر سال ہزاروں لوگ مختلف ڈگریاں لیے کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکل رہے ہیں' یہ سب تو بہت زور و شور سے جاری ہے اسی افراتفری میں ہم شاید یہ بھول گئے ہیں کہ علم ہے کیا؟ ''علم'' کے لغوی معنی ہیں ''جاننا'' اس جاننے میں سب سے پہلے تو خود شناسی آتی ہے۔ ایک انسان یہ جانے بغیر کہ اسے اس دنیا میں کس مقصد کے لیے بھیجا گیا ہے کچھ بھی کر گزرے کتنی ہی ڈگریاں لے لے وہ منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ ایک ڈاکٹر کی مثال لے لیں کتنی فصیح کتابیں پڑھنے کے بعد ایک ڈاکٹر اس قابل بنتا ہے کہ انسانی جسم کے ہر حصے سے واقف ہوتا ہے اور بعض اوقات یہی ڈاکٹر مریض کی بے بسی سے فائدہ اٹھا کر آپریشن کے دوران جسم کے حصے نکال کر بیچ بھی دیتا ہے۔ اسی طرح ایک بہت اچھے پرائیویٹ سکول کی پرنسپل کو ایک ایسے سیمینار کی دعوت بھیجی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہم صرف اچھے انسان بن کر ہی اچھے استاذ' ڈاکٹر یا ماں باپ بن سکتے ہیں۔ پرنسپل صاحبہ نے یہ کہہ کر آنے سے معذرت کر لی کہ مجھے انسانوں کے اچھے ہونے میں کوئی دلچسپی نہیں مجھے تو صرف اچھے ٹیچرز سے غرض ہے ہاں اگر اس سلسلے میں آپ میری مدد کر سکیں تو بتائیں۔ اس طرح کی محدود سوچ رکھنے والوں سے کیا اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ کس قسم کے طلباء ہمارے معاشرے کو دے سکتے ہیں۔

اگر ہم نے اپنی سوچ نہ بدلی اور اس طرح کے ڈاکٹر' اساتذہ اور اس طرح کے سکولوں سے نکلے ہوئے بچے ہی

قوم کو ورثے میں ملے تو ہماری حالت بد سے بدتر ہوتی جائے گی۔ ذرا غور کریں تو اب تک ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ زندگی میں بے جا بھاگ دوڑ چھوڑ کر ہمیں اپنی پوری توجہ یہ جاننے میں لگا دینی چاہیئے کہ دنیا میں ہم کس مقصد کے تحت بھیجے گئے ہیں؟ یہ جاننا ہی ہمارے علم حاصل کرنے کے سفر کا پہلا قدم ثابت ہوگا۔ اصل مقصد کو جان لینے کے بعد ہی ہم زندگی گزارنے کا وہ طریقہ اختیار کریں گے جو ہمیں منزلِ مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔

قرآن مجید کا فرمان ہے کہ:

'' اور وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں بنایا اور اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا (تمہارے پیدا کرنے سے) مقصود یہ ہے کہ وہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے عمل کے لحاظ سے بہتر کون ہے۔ '' (11: 7)

'' اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون اچھے کام کرتا ہے۔ '' (67: 2)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ:

'' جس نے حلال طریقہ سے اس لئے دنیا طلب کی کہ بھیک مانگنے سے بچے اور اپنے گھر والوں پر خرچ کرے اور اپنے پڑوسی پر رحم کرے تو قیامت کے دن وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتا ہوا ہوگا۔ اور جس نے حلال طریقہ سے دنیا اس لئے طلب کی کہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ جمع کر لے اور دوسروں پر فخر کرے اور دکھاوا کرے تو خدا سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ خدا اس پر غصہ ہوگا۔''

(مشکوٰۃ، بیہقی)

یہ حدیث صاف بتاتی ہے کہ دین و دنیا کی تفریق غلط ذہن کی پیداوار ہے۔ علم و تعلیم کا فرق جاننا بہت ضروری ہے۔ تعلیم ایک انسان کی مدد تو کر سکتی ہے لیکن منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے تو علم یعنی جاننے کی ضرورت ہے۔ اس جاننے میں حقوق و فرائض کا جاننا، صحیح و غلط جاننا، مقصدِ حیات کا جاننا اور پھر اس راستے کا تعین کرنا شامل ہے جو ہمیں منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔ ہم نے علم کو ڈگری تک محدود کر دیا ہے جس وجہ سے پوری انسانیت خسارے کا شکار ہے۔ اس انتہائی تکلیف دہ دائرہ کار سے نکلنے کے لیے ہمیں اپنی سوچ بدلنی ہوگی۔ وہ راستے جن پر ہم اب تک بھٹک رہے ہیں چھوڑ کر نئی راہیں متعین کرنا ہوں گی۔ قدرت کے قوانین کے مطابق ہر لمحہ سیکھنے کی صلاحیت اجاگر کرنی ہوگی کیونکہ انسان خدا کی قدرت کو سمجھنے کے لیے ہی بنایا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے

ہیں کہ :

'' ایک شخص نماز بھی پڑھتا ہے، روزہ بھی رکھتا ہے، زکوٰۃ بھی دیتا ہے، حج اور عمرہ بھی کرتا ہے یہاں تک کہ آپ نے تمام نیکیوں کا ذکر کیا مگر قیامت کے روز اس کی عقل وفہم کے مطابق ہی اس کا صلہ دیا جائے گا۔ '' (مشکوٰۃ المصابیح)

یہ عقل وفہم ہی ہے جس سے ہم صحیح وغلط کی پہچان کر کے خدا کی طرف سے دی گئی آزمائش پر پورے اتر سکتے ہیں اور اپنی دین اور دنیا کو سنوار کر سرخرو ہو سکتے ہیں۔ آیئے آج سے یہ وعدہ کریں کہ ہم اپنی تمام تر محنت اچھا انسان بننے میں صرف کر دیں گے۔ یہ محنت یقیناً ہمیں اچھا ڈاکٹر، اچھا استاد یا پھر اچھے ماں باپ بننے میں مدد دے گی اور ایسا کرنے سے ہم بہت سی غیر ضروری مصروفیات اور خواہشات سے بچ جائیں گے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے ہمیں صرف اچھی سوچ اور زندہ ضمیر چاہیئے جو ہم سب کے پاس موجود ہے۔

☆ _____ ☆